محمد جعفر ندوی پھلواروی

ازدواجی زندگی کیلئے اہم قانونی تجاویز

(۲)

(سلسلہ کے لئے دیکھئے "ثقافت ماہ جنوری)

بعد از نکاح

ولیمہ نکاح و رخصتی کے بعد عموماً پہلا مرحلہ ولیمے کا ہوتا ہے۔ کچھ پابندیاں اس پر بھی عائد ہونی چاہئیں یعنی مہر و جہیز کی طرح اس کے لئے بھی آمدنی کے ایک تناسب کی تعیین کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس طرح کی نمائشی دعوتوں میں اکثر لوگ مقروض ہو کر اپنی پریشانیوں کو دعوت دیتے ہیں۔

مناقشہ اور اس کے نتائج کہتے ہیں کہ جہاں کئی برتن ہوں وہاں باہمی ٹکراؤ سے برتنوں میں آواز پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ ابتداءً زوجین کی زندگی کئی عوامل کی وجہ سے بڑی خوش گوار اور بے فکری کی ہوتی ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد قدرۃً ردِّ عمل شروع ہوتا ہے۔ اگر دونوں صاحبِ فہم ہوئے تو جنّت کی زندگی کا آغاز اسی دُنیا سے ہو جاتا ہے۔ دونوں بے عقل ہوئے، تو جہنّمی زندگی میں شبہ نہیں۔ اور اگر ایک عاقل اور دوسرا بے عقل ہُوا تو اعراف کی زندگی کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔

جب ابتدائی باہمی اُلفت کا ردِّ عمل کش مکش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تو پھر اس کش مکش کا بھی ردِّ عمل بشکلِ انس و محبّت ہوتا ہے۔ اور اسی ردِّ عمل اور ردِّ ردِّ عمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس دوران میں اگر کسی وقت دونوں جانب یا کسی ایک جانب کا دماغی پارہ زیادہ چڑھ جائے، تو مفارقت کا پروگرام بن جاتا ہے۔ یا تو مرد طلاق دے دیتا ہے۔ یا عورت مطالبۂ طلاق کرتی ہے۔ تِل کے برابر بات سے آغاز ہوتا ہے، اور انجام کار اس تِل کے اوٹ ایک بڑا پہاڑ کھڑا ہو جاتا ہے۔

ازدواجی زندگی کا یہ دَور بڑا ہی نازک ہوتا ہے، یعنی:۔

کبھی مرد طلاق دینا چاہتا ہے مگر عورت کی روح طلاق کے نام سے کانپتی ہے۔

کبھی عورت طلاق لینا چاہتی ہے اور مرد اسے پسند نہیں کرتا۔

کبھی دونوں چاہتے ہیں مگر معاشرتی و اقتصادی، خانگی یا اولادی مجبوریوں سے دونوں خاموش رہتے ہیں۔

کبھی دل طلاق دے چکا ہوتا ہے، مگر زبان خاموش رہتی ہے۔

کبھی زبان سے طلاق نکل چکی ہوتی ہے، لیکن دل اس کے ساتھ نہیں ہوتا۔

کبھی بلکہ اکثر فوری وقوع طلاق کے بعد کوئی ایک یا دونوں اپنی قسمت پر رونے بیٹھ جاتے ہیں اور اس غلطی کی تلافی

کے لئے لوگوں سے حل دریافت کرتے پھرتے ہیں۔

اور شاذونادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے واقعی سوچ سمجھ کر علٰحدہ ہونا چاہتے ہیں اور طلاق کے بعد اپنے دل میں دونوں سکون و اطمینان محسوس کرتے ہیں اور مستقبل بھی دونوں کا بہتر ہو جاتا ہے۔ یہی ہے وہ مقام جہاں طلاق کی اصلی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہاں طلاق اسی طرح دونوں کے لئے رحمت ہوتی ہے، جس طرح سنکھیا مدبّر ہونے کے بعد بعض مریضوں کے لئے اکسیر کا کام کرتی ہے یہی ہے وہ موقع طلاق جس کے لئے قرآنی الفاظ یوں ہیں :-

وان یتفرقا یغن اللہ کلا من سعتہ

اگر زوجین ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں، تو اللہ تعالےٰ ان دونوں کو اپنے فضل سے بے نیاز کر دے گا۔

اس ایک شکل کے علاوہ اور جتنی شکلیں طلاق کی ہیں وہ سب مصیبتیں اور انسانیت کے لئے دُکھ اور قانونِ جواز کا بڑا مکروہ استعمال ہے یہی سبب ہے حضور نے طلاق کو "ابغض الحلال" فرمایا ہے حضرت ابنِ عمر سے ابوداؤد میں یہ حدیث رسول مروی ہے کہ

ابغض الحلال الی اللہ الطلاق

اللہ کے نزدیک جائز چیزوں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت چیز طلاق ہے۔

یہ حدیث بڑی معنی خیز ہے جس کا مقصد انسان کو قانون سے بالاتر رکھ کر ذوقِ سلیم اور اخلاقی اقدار پیدا کرنا ہے۔ طلاق، قانونی حیثیت سے ایک جائز مؤثر وجود[1] تو ضرور ہے، لیکن خدا کی نگاہ میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ شبہ ہو سکتا ہے کہ جو چیز خدا کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور قابلِ نفرت ہو وہ جائز کیونکر ہو سکتی ہے؟ یہیں آکر قانون اور ذوقِ سلیم (یا اخلاقی قدروں) کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے ایک چینی یا روغنی مٹی کے "پاٹ" کو سوڈے اور صابن اور کیمیکل اجزا سے خوب صاف کر دیا جائے اور اسے آبِ زمزم سے تین بلکہ سات بار دھو دیا جائے تو اس کے طاہر و مطہر ہونے میں فقہی قانون سے قطعاً کوئی کلام نہیں لیکن اس میں شوربے دار سالن رکھ کر اس سے روٹی کھانا کوئی ذوقِ سلیم رکھنے والا پسند نہیں کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ جب قانونی حیثیت سے ایک کام جائز ہے تو اس کے کرنے میں تامل کیوں؟ یہ فرق ہے قانونی اباحت اور ذوقِ سلیم کی اجازت میں۔ اسلام صرف قانون کا نام نہیں بلکہ وہ قانون کی راہ سے ایسا مذاقِ سلیم اور اخلاقی حس پیدا کرنا چاہتا ہے کہ انسان قانون سے بالاتر رہ کر زندگی گزارے اور قانون کی بجائے اپنے ضمیر و اخلاق اور حُسنِ مذاق کے دباؤ میں رہے۔ اس کے متعلق ہم پچھلی قسط میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔

بہرحال یہ "ابغض الحلال" کا لفظ تقنین کی جان ہے۔ یعنی ہمیں طلاق کے متعلق کوئی قانون بناتے وقت اس کا بڑا لحاظ رکھنا چاہئے۔ کہ ہماری بحث صرف قانونی حلّت سے نہ ہو بلکہ اس کی "ابغضیت" کا احساس زوجین کی روح میں پیوست رہے۔ کیونکہ اوپر کی بیان کردہ آخری

---

[1] انجیل کی رُو سے اس وقت تک طلاق نہیں ہو سکتی جب تک زوجین میں سے کوئی ایک زانی نہ ثابت کر دیا جائے۔ اور ہندو دھرم شاستر میں طلاق کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اب البتہ مجلس قانون ساز کے ذریعے اُنہوں نے طلاق کو مؤثر وجود تسلیم کرا لیا ہے۔

شکل طلاق کے سوا جتنی شکلیں طلاق کی ہیں وہ ابغض الحلال ہی کی ہیں اور قانوناً جائز ہونے کے باوجود دونوں زوجین کی یا احد الزوجین کی زندگی کو خراب کرتی ہیں۔ ایسی حالت میں تقنین طلاق کے وقت ہمیں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے!

(۱) ایسی صورتیں اختیار کی جائیں کہ وقوع طلاق کا امکان اگر مفقود نہ ہو سکے ــــ تو کم سے کم ہو جائے۔ کیونکہ جمع "تفریق" پر مقدّم ہے۔

(۲) زوجین میں جو مظلوم ہو، اس کے نقصان اور دل شکنی کی تلافی ہو۔

(۳) فوری غصّے کی طلاق کی قانونی روک تھام ہو۔

(۴) زبانی طلاق کو جو عموماً فوری ہوتی ہے موثر نہ قرار دیا جائے۔

ان تمام نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہماری رائے میں طلاق کے متعلق مندرجہ ذیل قوانین نافذ کرنے چاہئیں؛

۱۔ بعث حکمین کے بغیر طلاق کو بے اثر مانا جائے۔

بعث حکمین کا حکم قرآن پاک میں یوں ہے :-

وان خفتم شقاق بینهما فابعثوا حکماً من اهله وحکماً من اهلها ان یریدا اصلاحاً یوفق الله بینهما ۔ ......

اگر تمہیں زوجین کے باہم جدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکم شوہر کے خاندان سے اور ایک بیوی کے خاندان سے لے لو۔ اگر یہ دونوں صلح و صلاح کی نیّت رکھتے ہوں گے تو اللہ ان کو باہم ملا دے گا

یہ حکم طلاق سے پہلے کے لئے ہے، لیکن عمل میں اور فقہ میں معلوم نہیں کیوں اسے کوئی اہمیّت حاصل نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اسے سلسلۂ طلاق کی ایک لازمی کڑی قرار دینا چاہئیے۔ اهله اور اهلها کے لفظ کو صرف خاندان سے وابستہ نہیں رکھنا چاہئے بلکہ اس کا مقصد وہی معلوم ہوتا ہے، جو ہمدرد وکیل کا مفہوم ہے۔ وہ پنچایت بھی جس میں دونوں طرف کے نمایندے موجود ہوں، اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ اگر حکومت اس غرض کے لئے ہر حلقے میں ایک ایک مصالحت کمیٹی بنا دے، جب بھی قانون کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

۲۔ بعث حکمین کے بعد بھی اگر طلاق پر اصرار ہو، اور کوشش جمع کارگر نہ ہو تو جس کی طرف سے طلاق کی خواہش ہو اسے علیحدگی میں سمجھا کر اتمامِ حجّت کیا جائے۔ اور اصل وجہ طلاق معلوم کر کے اس کا ازالہ کیا جائے۔

بعث حکمین کا مقصد مفارقت کے عوامل کو دُور کر کے مصالحت پیدا کرنا ہے۔ لہٰذا ان کا کام صرف وکالت زوجین کرنا نہیں بلکہ اس غرض کے لئے انہیں زوجین کو الگ الگ بھی سمجھانا چاہیئے، تاکہ دونوں اپنے اپنے مطالبات یا شکایات میں کچھ نرمی پیدا کر کے صلح کی طرف قدم بڑھائیں، اس لئے اس دفعہ کے لئے کسی خاص استشہاد کی ضرورت نہیں۔

۳۔ بحالتِ ایام ماہواری یا بحالتِ طہر جس میں مواصلت ہوئی ہو کی طلاق صحیح تسلیم نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ ایک مرض ہے۔ جس میں اکثر اوقات عورت کا توازن دماغی اپنے اصلی مقام پر نہیں رہتا۔ نیز مردوں کے عام طبائع اس حالت میں گریزاں رہتے ہیں۔

حکم قرآنی ہے کہ:

اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ ..... الخ

جب تم عورتوں کو طلاق دو، تو ان کی عدت کے لئے دو (یعنی حالتِ طہر میں دو تاکہ شمارِ عدت میں سہولت ہو) اور عدت کو شمار کرتے رہو۔

حضرت ابنِ عمر نے اپنی بیوی کو بحالتِ حیض طلاق دے دی تو حضور نے حکم دیا کہ رجوع کر کے ایسی طہر میں طلاق دو، جس میں مواصلت نہ ہوئی ہو۔ (رواہ الخمسہ الا الترمذی)

اس حدیث کی رُو سے ایسی طلاق جو بحالتِ حیض دی جائے واقع تو ہو جاتی ہے، لیکن اس کا رجوع کرنا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اگر وقوع اور پھر رجوع کے لمبے چکر میں پڑنے کی بجائے اسے کالعدم ہی قرار دے دیا جائے، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس میں کئی مصلحتیں ہیں:

(الف) بحالتِ ایّام عورتوں کا توازن دماغی عموماً عدم توازن سے بدل جاتا ہے۔ اس لئے اس حالت کی کسی ناپسندیدہ بات کو وجہ طلاق نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(ب) اس حالت میں مردوں کے طبائع میں بھی ایک گریز و تنفّر ہوتا ہے، لہٰذا اس عارضی گریز کو بھی سببِ طلاق نہیں بننے دینا چاہئے۔

(ج) طہر کے لئے یہ شرط بھی از روئے حدیث بہت صحیح ہے کہ اس میں وطی نہ کی گئی ہو۔ طلاق کے بعد وطی کا مطلب بالاتفاق رجوع ہے۔ لہٰذا اس شرط سے رجوع کا امکان قوی تر ہو جاتا ہے۔

۴۔ اشہادِ شاہدین کے بغیر جو طلاق ہو وہ بھی صحیح نہ تسلیم کی جائے۔

حکمِ قرآن ہے کہ:

واشھدوا ذوی عدل منکم ..... الخ

طلاق کے لئے دو معتبر گواہ بنا لیا کرو

اس حکم قرآنی کے مطابق اشہادِ شاہدین ضروری معلوم ہوتا ہے، لیکن عمل اور فقہ میں اس کو معلوم نہیں کیوں زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ ہماری رائے میں اشہادِ شاہدین کے بغیر کوئی طلاق تسلیم نہیں کرنی چاہئے۔ گواہ بھی وہ ہونے چاہئیں جن کو پہلے سے بتا دیا جائے کہ اس مقصد کے لئے تمہیں بلایا جا رہا ہے تاکہ وہ صرف گواہ بننے کے لئے نہ جائیں بلکہ خدا توفیق دے تو سمجھا بجھا کر اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش بھی کریں۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ ان دو گواہوں میں ایک شوہر کے خاندان کا اور دوسرا بیوی کے خاندان کا ہو۔

۵۔ طلاق رجعی کے علاوہ ساری اقسامِ طلاق جو دفعۃً دی گئی ہوں کالعدم قرار دی جائیں۔

۶۔ اگر بیک مجلس تین یا زیادہ طلاقیں دی جائیں، تو اسے رجعی ہی قرار دیا جائے۔ یا فقہ شیعہ کی طرح اسے طلاق لغو قرار دیا جائے۔ یعنی وہ ایک طلاق بھی نہیں ہوتی۔

طلاقیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ فقہ میں اس کی تشریح یوں ہے کہ:

(الف) تین طلاقیں دی جائیں تو وہ مغلظہ ہوتی ہیں اور زوجین پھر اس وقت تک زوجین نہیں بن سکتے، جب تک اس مطلقہ کا مکمل[1] عقد ثانی ہو کر پھر دوسرے شوہر سے (طلاق یا موت کی وجہ سے) جدائی ہو کر عدت نہ پوری ہو جائے۔

(ب) تین سے کم طلاقیں دی جائیں اور عدت گزر جائے تو وہ بائنہ ہوتی ہے جس کے بعد زوجین میں جدائی تو ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ دونوں پھر زوجین بننا چاہیں تو تجدید نکاح کے بعد وہ پھر زوجین بن سکتے ہیں۔

(ج) اور مذکورہ صورت میں عدت نہ ختم ہوئی ہو تو قول یا عمل[2] سے رجوع ہو سکتی ہے اور وہ حسب سابق بلا تجدید نکاح کے زوجین رہیں گے۔

عوام یہ قسمیں نہیں جانتے اور نہ وہ طلاق دینے سے پہلے کسی سے مشورہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ طلاق کے معنی ہی ہیں تین طلاق۔ جب تک یہ عمومی ناواقفیت موجود ہے اسوقت تک مغلظہ طلاق کو قانوناً بے اثر رکھنا چاہیئے۔ شوہر ایک مجلس میں جتنی طلاقیں بھی دے اسے رجعی ہی قرار دینا چاہیئے۔ تاکہ عدت کے اندر رجوع کا اور بعد عدت تجدید نکاح کا امکان باقی رہے۔

طلاق سگانہ بیک مجلس تین طلاقیں جو دفعۃً دے دی جائیں وہ حضورؐ کے وقت میں اور عہد صدیقی میں اور کچھ مدت تک عہد فاروقی میں رجعی سمجھی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر کہ لوگوں نے اسے مذاق بنا رکھا ہے، یعنی طلاقیں دیں اور پھر رجوع کر لیا، یہ حکم دے دیا کہ اب جو بھی تین طلاقیں دے گا وہ رجعی نہیں سمجھی جائیں گی بلکہ مغلظہ ہونگی۔ یہ حکم دینے کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ مغلظہ ہونے کے خوف سے ایک تو طلاق کی کثرت رک جائے اور اگر طلاق ضروری ہی ہو تو وہ سنت کے طریق پر ـــــ یعنی ہر طہر بے وطی میں ایک طلاق ـــــ دی جائے تاکہ زوجین کو اپنے مستقبل کے تمام نشیب و فراز پر اچھی طرح غور و خوض کرنے کا موقع ملے۔ حضرت عمر کے اس حکم کے بعد آج تک لوگ ایسی طلاق کو مغلظہ مانتے چلے آرہے ہیں اور اس چیز نے ازدواجی زندگی میں ایسی پیچیدگی سی پیدا کر دی ہے، جس کا کوئی حل نہیں نکلنے پاتا۔ ہمارے پاس بیسیوں استفتے اسی قسم کے آتے رہے ہیں کہ شوہر نے کسی فوری غصہ و رنج میں آکر تین طلاقیں ایک ساتھ دے دیں ـــــ اس لئے کہ عام طور پر طلاق کے معنی ہی تین طلاق کے سمجھے جاتے ہیں ـــــ اور پھر زوجین اپنی قسمت پر رونے بیٹھ گئے، کیونکہ یہ طلاق تو مغلظہ ہو گئی اور اب رجوع کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس کا حل لوگوں نے یہ نکالا کہ عورت کا کسی سمجھائے بجھائے آدمی سے نکاح ثانی کرا دیا اور ایک شب کے بعد دوسرے دن طلاق دلوا دی، اس کے بعد خود نکاح فرما لیا۔ اس مکروہ فعل کا نام ہے حلالہ یا تحلیل۔ یہ دوسرا عقد ایک ایسا نکاح ہے جس میں زوجین بن کر رہنے کا کوئی تصور نہیں ہوتا بلکہ طلاق دلوانے ہی کے لئے یہ نکاح کرایا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حلالہ کرنے والے

---

[1] مکمل کا مطلب یہ ہے کہ فقط زبانی نکاح ہو جانا کافی نہیں بلکہ وظیفۂ ازدواج بھی ادا ہونا چاہیئے۔ (از روئے حدیث)

[2] محض زبان سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں نے اپنی طلاق واپس لی، اور بغیر کچھ کہے اگر وظیفۂ ازدواج ادا کر لیا جائے تو یہ بھی عمل رجوع ہے۔

اور حلالہ کرانے والے دونوں ہی پر لعنت فرمائی ہے بلکہ حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک فرمایا کہ میرے پاس ایسا کوئی مقدمہ آیا تو ان دونوں کو میں رجم کروں گا۔ اہل السنت نے اس رجم کی تہدید کو تو لیا نہیں، صرف ایک حکم کو لے لیا کہ تین طلاقیں مغلظ ہوتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اگر ایسی تین طلاقوں کو مغلظہ قرار دیا تھا تو دوسری طرف حلالے کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا تاکہ طلاق جب ہو تو دفعۃً نہ ہو بلکہ طلاق سُنّی ہو۔ لیکن ہم لوگوں نے صرف حکمِ تغلیظ کو قبول کر لیا جس کے نتیجے میں کثرتِ طلاق تو نہ رُک سکی مگر حلالے کا دروازہ بُری طرح کھُل گیا اور اس سلسلے میں کئی دلچسپ واقعات بھی ہم نے دیکھے ہیں یعنی حلالے کا وعدہ کرنے والے شوہرِ ثانی نے عورت کو مستقلاً ہی اپنے پاس رکھ لیا اور پہلا اصلی شوہر عمر بھر پچھتاتا رہا۔

یہ یک مجلس طلاق سہ گانہ کے متعلق ہم یہاں صرف دو عبارتیں نقل کر کے فیصلہ آپ پر چھوڑتے ہیں۔ پہلی عبارت "اعلام الموقعین" لابنِ قیم کی ہے جو لکھتے ہیں کہ:

افتى بن عباس وعلى وبن مسعود بان الطلقات الثلث من فم واحد واحدۃ وایضاً افتوا بانها مغلّظة، وافتى الزبير بن العوام وعبد الرحمٰن بن عوف و عكرمة وطاؤس ومحمد بن اسحٰق وخلّاس بن عمرو والحارث العكلى وداؤد بن على واكثر اصحابه وبعض اصحاب مالك وبعض اصحاب الحنفية وبعض اصحاب احمد بانها واحدة .... ان الافتاء بانها مغلظة يوجب التحليل والتحليل هو قد لعن رسول صلے اللہ علیہ وسلم على المحلّل والمحلّل له حتى قال بن خطاب لا اوتى بمحلّل ولا بمحلل له الا رجمتها ...... المحلّل هو التيس المستعار (ج صفحہ ۲۴ تا ۳۲)

عبداللہ بن عباس، علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن مسعود سے دونوں طرح کی روائتیں ہیں یعنی بیک مجلس تین طلاقیں ایک ہی (رجعی) ہونگی اور یہ بھی کہ وہ مغلظہ ہوں گی۔ زبیر بن عوام، عبدالرحمان بن عوف، عکرمہ، طاؤس، محمد بن اسحاق، خلاس بن عمرو، حارث عکلی، داؤد بن علی اور ان کے اکثر پیرو، بعض مالکیہ نحو بعض حنفیہ اور بعض حنابلہ (مثلاً ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہما) اس کے قائل ہیں کہ ایسی طلاقیں ایک ہی (رجعی) ہونگی .... اس کے مغلظہ ہونے کا فتویٰ حلالے کا موجب ہوتا ہے اور حلالہ ایسی حرکت ہے جس کے کرنے والے اور کرانے والے دونوں ہی پر حضورؐ نے لعنت فرمائی ہے۔ حتیٰ کہ سید عمر بن خطاب کا فرمان تھا کہ اگر میرے پاس ان دونوں کا معاملہ آئے تو میں دونوں کو سنگسار کروں گا .... حلالہ کرنے والا تو صرف ایک سانڈ بکرا ہے جو مستعار لیا جاتا ہے۔

حنفی فقہ کے زبردست وکیل مولانا عبدالحی فرنگی محل کے فتاوے میں لکھا ہے کہ:

ایسی طلاق اگر موجب ہو بہت سی دشواریوں کا تو کسی شافعی عالم سے فتویٰ لے کر رجوع کر لیا جائے انتہیٰ

ملخصاً (فتاویٰ مولانا عبدالحی مسئلہ ۲۷۶)

سچ پوچھئے تو اس کے رجعی ہونے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ حضور کے عہد میں اور دورِ صدیقی میں اور دو سال تک خود عہد فاروقی میں یہ رجعی ہی تھی۔ اور جس مصلحت سے دورِ فاروقی میں سے مغلظہ قرار دیا گیا تھا وہ مصلحت اب باقی ہی نہیں رہی۔ بہرحال ہم نے اس کے علاوہ بھی کئی ثبوت اس کے رجعی ہونے کے پیش کر دئے ہیں۔ تاکہ ہمیں اس میں منفرد نہ سمجھا جائے، اور ہماری اس تجویز کو کہ: بیک مجلس کتنی ہی طلاقیں ہوں ان کو رجعی ہی قرار دیا جائے، قانونی حیثیت دینے میں کوئی جھجک نہ ہو۔

۷۔ عدت طلاق مکمّل ہونے تک زوجین کو ایک ہی گھر میں حسب سابق رکھا جائے اور حسب سابق بیوی کے تمام اخراجات شوہر ہی کے ذمے ہوں۔ عدّت مکمّل ہونے تک زوجین کو اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو مکمل طور پر سوچ سمجھ لینے کا موقع ملنا ضروری ہے۔

۸۔ تکمیل طلاق کے بعد اگر عورت حاملہ ہو تو وضع حمل تک کے اخراجات شوہر کے ذمے ہوں۔

۹۔ ولادت کے بعد ارضاع — خواہ یہ فرض بیوی کیوں نہ ادا کرے — کے اخراجات شوہر کے ذمے ہوں۔

حکم قرآنی ہے کہ:

> اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم ولا تضاروھن لتضیقوا علیھن وان کن اولات حمل فانفقوا علیھن حتیٰ یضعن حملھن فان ارضعن لکم فاتوھن اجورھن وأتمروا بینکم بالمعروف ......
>
> ایسی مطلقہ عورتوں کو زنا اختتام اجل، وُجد (یعنی محبت، خوشی اور استطاعت) کے مطابق وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو اور انہیں تنگ کرنے کے لئے انہیں نقصان نہ پہنچاؤ۔ اگر وہ حاملہ ہوں تو وضع حمل تک ان کے اخراجات اُٹھاتے رہو۔ اگر وہ (مطلقہ ہو چکنے کے بعد) دودھ پلائیں تو ان کی مزدوری بھی ان کو دیتے رہو۔ اور عمدگی کے ساتھ باہم مشورہ کرتے رہو۔

ان احکام کو بھی ہماری عملی زندگی میں کوئی اہمیّت حاصل نہیں۔ بس یہ سمجھا جاتا ہے کہ طلاق ہوگئی تو اب شوہر تمام ذمہ داریوں سے چھوٹ گیا اور اس پر کوئی بوجھ نہیں رہا۔ حالانکہ اسے طلاق کا ارادہ کرنے سے پہلے معلوم ہونا چاہئے، کہ یہ چھٹکارا اتنا سہل نہیں۔

۱۰۔ طلاق اگر مرد کی خواہش سے ہو تو اس کے مکمّل ہونے کے بعد وہ تمام چیزیں جو وہ اپنی عورت کو کبھی دے چکا ہو — خواہ وہ زمین ہو یا مکان، زرِمہر ہو یا زیور، لباس پوشاک ہو یا ظروف وغیرہ — وہ سب عورت ہی کی ملکیت تصوّر کی جائے۔

ارشاد قرآنی ہے کہ:

> وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم احدٰھن قنطارا فلا تاخذوا منہ

شیئا.......

اگر ایک بیوی کو الگ کرکے دوسری لانے کا ارادہ رکھتے ہو، اور پہلی کو دولت کا ڈھیر بھی دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

۱۱۔ عورت کو حقِ حضانت دیا جائے۔ اور اس اثناء کے اخراجات شوہر کے ذمّے ہوں بشرطیکہ یہ سپردگی کی خواہش شوہر کرے، اور عورت عقدِ ثانی نہ کرے۔ ورنہ عورت کے ذمے ہو۔

مطلقہ کی اولاد کے متعلق عمرو بن شعیب کے دادا سے ابوداؤد میں ایک روایت یوں ہے کہ:

ان امرأۃ اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت ان ابنی ھذا کان بطنی لہ وعاء و ثدیی لہ سقاء وحجری لہ حواء وان اباہ طلقنی واراد ان ینزعہ منی فقال صلی اللہ علیہ وسلم انت احق بہ مالم تنکحی۔

حضورؐ کے پاس ایک عورت نے آکر کہا کہ: یا رسول اللہ یہ میرا بچّہ ہے جس کے لئے میرا شکم اس کا ظرف میرا سینہ اس کا مشکیزہ اور میری گود اس کا مسکن بنا رہا۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اس بچّے کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: جب تک تیرا عقدِ ثانی نہ ہو اس بچّے کی حقدار تُو ہی ہے۔

"حضانت" کا مسئلہ یہیں سے نکلا ہے یعنی جُدائی کے بعد بچّے کی پرورش کا حقدار کون ہے؟ قرآن باپ کو "مولود لہٗ" کہتا ہے۔ یعنی بچّہ باپ ہی کا ہے۔ لیکن پرورش کون کرے؟ یہ ظاہر ہے کہ ماں سے بہتر پرورش کوئی نہیں کر سکتا۔ حضورؐ نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ لیکن یہ شرط بھی لگائی ہے کہ جب تک عقدِ ثانی نہ کرے۔

یہاں دو باتیں قابلِ غور ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حق حضانت کب تک کے لئے ہے؟ دوسرے یہ کہ دورانِ حضانت کے اخراجات کس کے ذمے ہوں؟

پہلی چیز میں فقہاء کا بڑا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور اسحاق لڑکے کی مدّت حضانت سات آٹھ سال بتاتے ہیں۔ حنفیہ اور ثوری کے نزدیک عمرِ حضانت یہ ہے کہ بچّہ خود کھا اور پہن سکے اور لڑکی کے لئے سب بلوغ بتاتے ہیں۔ امام مالک کے نزدیک لڑکے کا حقدار تا بلوغ باپ ہے اور لڑکی کی مستحق تا نکاح ماں ہے۔

دوسری چیز کے متعلق ہمیں واضح حکم نہیں ملا۔ اس سلسلے میں عدل کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورت اپنی خواہش سے بچّے کو لینا چاہے تو اخراجات کا ذمہ وار بھی اسی کو ہونا چاہئے اور اگر باپ اسے ماں کے سپرد کرنا چاہے تو اخراجات باپ کے سر ہونا چاہئے۔

مالم تنکحی (مطلقہ کے عقدِ ثانی تک) کی قید صرف اس لئے لگائی گئی ہے کہ اغلباً بچّے کا بھلا اسی صورت میں ہے۔ عقدِ ثانی

کے بعد نئے باپ کا بچّے سے دلچسپی نہ لینا پھر زوجین کے تعلقات میں کچھ تلخی پیدا ہونے کی وجہ سے بچّے کی پرورش میں مطلوبہ خیر کا نہ پیدا ہونا بھی قرینِ قیاس ہے یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اگر وہ مطلقہ بچّے کے ذی رحم مثلاً چچا سے نکاح کرلے تو اس کا حقِ حضانت باقی رہتا ہے فقہی مدّت حضانت میں مناسب ترمیم بھی ہوسکتی ہے۔

ہمارے خیال میں حقِ حضانت دیتے وقت یہ لحاظ ضروری ہے کہ مقصد پرورش پورا ہوتا ہو، محض شوہر کو محروم کرنا مقصد نہ ہو۔ مقصد پرورش صرف ضروریاتِ زندگی کی تکمیل ہی نہیں، معالجہ اور تعلیم و تربیت وغیرہ بھی ہے۔

۱۲۔ حلقے کے ذمے دار یا پنچایت (یا جسے مناسب سمجھا جائے) کی تحریری تصدیق کے بغیر طلاق کو مؤثر نہ تسلیم کیا جائے۔

باہمی قرض کے لین دین کے متعلق حکم قرآنی یہ ہے کہ:

اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ

جب تم آپس میں کسی مدّت تک کے لئے قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

ظاہر ہے کہ نکاح اور طلاق کا معاملہ تداین (قرضے کے لین دین) سے بہت زیادہ اہم ہے اس لئے نہ غیر تحریری نکاح کو تسلیم کرنا چاہئے اور نہ غیر تحریری طلاق کو۔

ہماری اس تجویز کو پڑھ کر بہت سے شبہات پیدا ہوں گے۔ سب سے بڑا شبہ تو یہ ہوگا، کہ ہماری فقہ میں ہر جگہ نکاح و طلاق کا انعقاد صرف زبانی اقرار پر رکھا گیا ہے۔ اس لئے اسے تحریر کے ساتھ مقید نہیں کرنا چاہئے۔ اس شبہے کے ازالے کے لئے مندرجۂ ذیل حقائق پر غور فرمائیے:

(۱) اسلامی قوانینِ طلاق کے متعلق پچھلی تحریروں میں یہ واضح ہوچکا ہوگا، کہ ان کا مقصد اس "ابغض الحلال" چیز میں رکاوٹیں پیدا کرنا ہے تاکہ یہ کام انتہائی ضرورت کے بغیر وجود میں نہ آئے۔ ادائے مہر، بعث حکمین، طلاق سُنّی وغیرہ سب کا یہی مقصد ہے۔ اور یہی مقصد کسی حد تک تحریر کی قید لگانے سے بھی پورا ہوگا۔ تحریر سے مُراد خود لکھ دینا یا کسی سے لکھوا لینا نہیں بلکہ کسی ذمے دار سے ـــــ خواہ وہ مجسٹریٹ ہو یا تحصیلدار یا پنچایت یا کوئی ایسی کمیٹی جو اس کام کے لئے مقرر کی جائے ـــــ تصدیق (CONFIRMATION) کرانا ہے۔ اس مرحلے کو طے کرنے میں ایک تو کچھ وقت لگے گا اور یہ عبوری وقت شوہر کے اس رنج کو دور کرنے میں مدد دے گا جو کسی فوری جذبے سے اس کے اندر پیدا ہوگیا ہو۔ دوسرے یہ کہ جس سے وہ اپنے طلاق نامے کی تصدیق کرائے گا۔ وہ بھی صرف تصدیق نہیں کرے گا بلکہ "حکمین" کی طرح سمجھانے بجھانے کی کوشش بھی کرے گا۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

(۲) اس سے پڑھنے لکھنے کی اُن جگہوں میں ترغیب بھی پیدا ہوگی جہاں سارے کام زبانی چلتے ہیں اور تحریر کا رواج نہ ہونے سے بعد میں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

(۳) تحریر یا شہادت کی اصلی ضرورت عند الناس یعنی قضا کے لئے ہوتی ہے ورنہ عند اللہ کس معاملے کی حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے بعض اوقات ایک انسان عند اللہ مجرم ہوتا ہے لیکن عند القضا اس کا جرم ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا

ہے کہ کسی پر عدالت کے نزدیک (جھوٹی گواہیوں سے) جرم ثابت ہو جاتا ہے لیکن عند اللہ وہ بالکل بے گناہ ہوتا ہے۔ اگر ایک زن و مرد بغیر کسی گواہ کے آپس میں مناکحت کر لیں تو عند اللہ تو وہ نکاح منعقد ہو جائے گا۔ یعنی آخرت میں وہ مجرم نہ ہوں گے۔ لیکن عند المعاشرہ اور عند القضا وہ نکاح شمار نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اس طرح تو پھر ہر ناجائز تعلق کے متعلق بھی دونوں کہہ دیں گے کہ ہم نے نکاح کر لیا تھا۔ پھر نکاح اور سفاح میں اور مناکحت و اتخاذ اخدان (خفیہ آشنائی) میں کیا فرق رہ جائے گا؟ پس یہی صورت طلاق کی بھی ہے۔ خدا جانے کتنے لوگ ہر آئے دن صریحی یا کنائی طلاق دیتے رہتے ہوں گے۔ جس کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی لیکن ان کو عند الناس زوجین ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ پس واقعی طلاق کے عند المعاشرہ طلاق ہونے کے لئے تحریر کی قید لگانے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ ہم یہاں عند اللہ کسی فیصلے کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ قانونِ قضا کا ذکر کر رہے ہیں اور اسی کے لئے تحریری طلاق کی شرط لگا رہے ہیں۔ قضا کے فیصلے صرف عند الناس والے فیصلے ہوتے ہیں اور ہر قانون کے مکمل ہونے کے بعد بھی کچھ گوشے ایسے ضرور رہ جاتے ہیں جن کے متعلق حضورؐ کا فیصلہ ہے کہ واصر الی اللہ (اس کا باقی معاملہ اللہ کے سپرد ہے)

(۴) اب عموماً نکاح تحریری ہی ہوتے ہیں تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ پڑے۔ لہٰذا طلاق کا تحریری ہونا کوئی شرعی قباحت نہیں بلکہ اس سے قانونِ طلاق کا ایک بڑا مقصد پورا ہوتا ہے جیسا کہ ابھی اوپر لکھا گیا ہے۔ (باقی آئندہ)

الدین یسر مصنفہ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی۔ جو لوگ اسلام کو بے جد دشوار اور ناممکن العمل سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کو ہماری غلطیوں نے ایک مصیبت بنا دیا ہے۔ ورنہ حضورؐ اکرم کے فرمان کے مطابق دین آسان سی چیز ہے۔ بہت سے مسائل اس میں ایسے آئے ہیں، جو اب تک اُلجھے ہوئے تھے۔ اور ان پر تفصیل سے عقلی و نقلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت چھ روپے

اسلام میں حیثیتِ نسواں مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی۔ پہلے یہ کتاب انگریزی میں شائع ہو چکی ہے۔ اب صدیقی صاحب نے اسے کسی قدر تغیر و ترمیم کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس میں عورتوں کے حقوق و فرائض کے بارے میں مصنف نے بیش بہا معلومات جمع کئے ہیں۔ اور بتایا ہے۔ کہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے عورتوں کو مسلم سوسائٹی میں مردوں کے مساوی مرتبہ حاصل ہے۔ نیز مغربی تصورِ مساوات کا فرق بھی واضح کیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ بیشتر اسلامی ممالک میں حقوقِ نسواں کا مسئلہ بڑی شدت کے ساتھ زیرِ بحث ہے اس کتاب کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ

سکرٹری ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۔ کلب روڈ۔ لاہور (پاکستان)